اسلامی تاریخ میں "اقتدار اعلیٰ" کا تصوّر

محمد نذیر کاکا خیل فیلو ادارۂ تحقیقات اسلامی

اقتدار اعلیٰ (SOVEREIGNTY) ایک جدید سیاسی اصطلاح ہے جو کہ لاطینی لفظ SUPARANUS سے نکلی ہے، جس کے معنی برتر و اعلیٰ SUPREME کے ہیں۔ بالفاظ دیگر ریاست کی وہ اعلیٰ ترین منشاء و مرضی، جس کی بنیاد طاقت پر ہے۔ علم سیاست میں ایک اصطلاح کی حیثیت سے اس لفظ کا استعمال فرانسیسی مفکر بودین (BODIN) کی معرکہ آراء تصنیف DE REPUBLICA سے شروع ہوتا ہے۔ بے شک اقتدار اعلیٰ کا تخیل بودین سے پہلے بھی عام تھا مگر یہ دوسرے ناموں سے موسوم تھا۔ ہم ارسطو کی تصانیف میں مملکت کے اندر "اختیار اعلیٰ" کا ذکر پڑھتے ہیں۔ رومن مقننین اور ازمنہ وسطیٰ کے مقننین مملکت کے "اختیار کامل" کا تذکرہ کرتے ہیں۔ مختصراً نام اس کے کچھ بھی ہوں مگر برتری و فوقیت کا تصوّر سب میں موجود ہے۔

مغربی نظریہ سیاسی کے مطابق ریاست کے عناصر اربعہ (آبادی، علاقہ، حکومت اور اقتدار اعلیٰ) میں سے اقتدار اعلیٰ کو اوّلین مقام حاصل ہے۔ اس کے بغیر کوئی ریاست، ریاست کہلانے کی مستحق نہیں۔ بقول مغربی مفکرین کے "جو مقام علم اقتصادیات میں "قدر" کو حاصل ہے، وہی اہمیت فلسفۂ سیاسی میں اقتدار اعلیٰ کو حاصل ہے"۔(۱) ہم اس بحث میں سب سے پہلے مغربی مفکرین کی آراء لیں گے اور اس نظریئے نے اُن کے ہاں جو ارتقائی منازل طے کیے ہیں، انہیں نہایت اختصار سے بیان کریں گے۔

جیسا کہ ابھی بیان کیا گیا، علم سیاست میں بطور اصطلاح کے، اقتدار اعلیٰ کو سب سے پہلے فرانسیسی مفکر بودین نے استعمال کیا۔ اس نے اقتدار اعلیٰ کی ان الفاظ میں تعریف کی ہے، "شہریوں اور عوام پر اعلیٰ اختیار جو کہ

---

(۱) انسائیکلو پیڈیا آف سوشل سائنسز، حصہ سوم۔ ص ۲۶۵۔

قانونی بندشوں سے آزاد ہو" (۲)

بودین کا یہ نظریہ اس وقت پیش کیا گیا جب کہ فرانس، انگلستان اور سپین میں بادشاہت کی بنیادیں پڑ رہی تھیں اور روما کا پوپ اُن کے مقابلے میں کلیسا کے تسلط کا مدعی تھا۔ بودین نے عین اس وقت یہ کہہ کر پاپائیت کے اس دعوے کو باطل قرار دیا کہ بادشاہ ہی مملکت کے اندر سب کچھ ہے اور پوپ کو اس پر کوئی اختیار نہیں۔ لیکن ساتھ ہی بودین نے بادشاہ کے اختیارِ مطلق پر ضروری پابندیاں بھی لگا دیں مثلاً یہ کہ وہ قانونِ خداوندی کا پابند ہوگا، فطری قوانین اور قوانینِ اقوام کا احترام کرے گا۔ ظاہر ہے یہ پابندیاں اس وقت اور اُن حالات کے مطابق ایک صحت مندانہ رجحان کی حامل تھیں۔

انگلستان میں سب سے پہلے اس نظریہ کو پیش کرنے والا تھامس ہابز (THOMAS HOBBES) تھا۔ اس کے نزدیک اقتدارِ اعلیٰ بادشاہ کو حاصل ہے۔ اور اس کا حکم قانون کی حیثیت رکھتا ہے۔ کیونکہ معاہدہ عمرانی کے وقت عوام تو اپنے اختیارات بادشاہ کو سونپ دیتے ہیں لیکن بادشاہ ایسا نہیں کرتا۔ اس یکطرفہ معاہدہ کے بعد ایک کامن ویلتھ وجود میں آجاتی ہے (۳)۔ اور بادشاہ عوام پر ان کی مرضی کے مطابق حکمرانی کرنے لگتا ہے۔ ہابز کے بعد جان لاک (JHON LOCKE) آتا ہے۔ اس کا معاہدہ عمرانی (SOCIAL CONTRACT) ہابز کی طرح یکطرفہ نہیں بلکہ بادشاہ بھی معاہدے کا ایک فریق ہے۔ لہٰذا وہ ریاست سے برتر نہیں۔ لاک کہتا ہے "گو عوام اپنے تمام سیاسی اختیارات بطور امانت بادشاہ کے سپرد کر کے سونے کے لئے چلے جاتے ہیں لیکن جانے سے قبل وہ بادشاہ سے کہتے ہیں کہ اگر اس نے امانت میں خیانت کی تو وہ اپنی نیند سے بیدار ہو جائیں گے اور اپنا حقِ بغاوت استعمال کر کے اس کو برطرف کر دیں گے" (۴)

انقلابِ فرانس کے مفکرین میں سے روسو (ROUSSEAU) نے اپنے نظریہ "ارادۂ عامہ" (GENERAL WILL) میں عوام کو طاقت کا سرچشمہ بتایا۔ اپنے اس نظریہ کی مدد سے وہ ایک دوسرے نظریہ "ریاست کی بنیاد افراد کی مرضی یا ارادہ پر ہے، جبر یا طاقت پر نہیں" کو ترقی دیتا ہے۔ اقتدارِ اعلیٰ کو عوام کے ہاتھوں میں دے کر وہ فرد کو دو مختلف کردار سونپتا ہے۔ ایک قانون سازی کا اور دوسرا قانون کی اطاعت کا۔ فرد مقتدرِ اعلیٰ ہونے کی وجہ سے قانون خود بناتا ہے لیکن رعایا ہونے کی وجہ سے اپنے ہی بنائے ہوئے قانون کی اطاعت کرتا ہے۔

---

(۲) R.H. MURRAY, THE HISTORY OF POLITICAL SCIENCE, P. 181

(۳) LEVIATHAN - EDITED BY EARNEST RHYS, CH. XVII, P.P. 89, 90

(۴) نسرین وحیدہ خان۔ افکارِ سیاسی۔ سرسید بک کمپنی کراچی (۱۹۶۴ء) ص ۱۳۵۔

اُنیسویں صدی کے آخیر میں اقتدار اعلیٰ کے ایک نئے نظریئے نے جنم لیا۔ یہ ہے "نظریۂ تکثیر پسندی"۔ اس نظریہ کو سب سے پہلے OTTO. V. GIERKE اور میٹ لینڈ نے پیش کیا۔ دوسرے مفکّرین کے علاوہ اس مکتب فکر میں میک آئیور (MCIVER) اور ہیرالڈ۔ جے۔ لاسکی (LASKI) کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ لاسکی کے قول کے مطابق "اقتدار اعلیٰ ریاست کی اعلیٰ ترین منشاء کا نام ہے۔" "ریاست کی حاکمیت کی بنیاد طاقت پر ہے جس کی مدد سے وہ اپنی منشاء پوری کر سکتی ہے۔ اور جبر کے اس قانونی حق کی ملکیت ہی کی بنیاد پر ریاست کو دوسرے اداروں سے ممتاز کیا جاتا ہے۔"

چونکہ علم سیاست میں اقتدار اعلیٰ کا مسئلہ سب سے زیادہ مختلف فیہ ہے، اس لئے اس مکتبِ فکر کے حامیوں نے یہاں تک کہہ دیا کہ اگر علمِ سیاسیات میں سے اس نظریئے کو سرے سے نکال ہی دیا جائے تو بہتر ہوگا۔ ان کے نزدیک ریاست اقتدار اعلیٰ کی اکیلی حامل نہیں۔ بلکہ دوسرے ادارے، جن کی افراد پر اطاعت لازمی ہوتی ہے، وہ بھی مقتدرِ اعلیٰ ہیں۔ لاسکی نے آسٹن کے اس نظریہ پر کہ اقتدار اعلیٰ لامحدود، مطلق العنان اور تمام پابندیوں سے آزاد ہے، سخت تنقید کی ہے۔ لاسکی کا کہنا ہے کہ اقتدار اعلیٰ نہ تو واحد ہے اور نہ مطلق بلکہ یہ "ذمہ دار دستوری اور تکثیری ہے۔"

(RESPONSIBLE CONSTITUTIONAL AND PLURALISTIC)

بین الاقوامی قانون کے ارتقاء اور ریاستوں کے ایک دوسرے پر معاشی انحصار نے تو اس نظریئے کی بنیادیں اور بھی ہلا دی ہیں۔ لیکن اس کے باوجود مغرب میں اس پر زور دیا جاتا ہے کہ اقتدار اعلیٰ عوام اور صرف عوام کو حاصل ہے۔ اخلاقی، فطری اور بین الاقوامی قوانین کی پابندیوں کے باوجود عوام مقتدرِ اعلیٰ رہ سکتے ہیں کیونکہ یہ پابندیاں عوام ہی نے اپنے اختیارات پر اپنے مفاد کی خاطر منظور کی ہیں۔

آئیے اب دیکھیں، اسلام میں اقتدار اعلیٰ کا کیا مفہوم ہے اور یہ کس کو حاصل ہے۔ رسول اکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ہجرتِ مدینہ کے بعد اسلامی ریاست کی بنیاد پڑتی ہے۔ "میثاقِ مدینہ" کو ہم تحریری دستور سے تشبیہ دے سکتے ہیں کیونکہ اس میں ایک طرف مدینہ کے انصار اور مکّہ سے آئے ہوئے مہاجرین کے حقوق و فرائض اور دوسری طرف مسلمانوں اور مدینہ کے یہودیوں کے حقوق و فرائض معین کئے گئے۔ جنگ و صلح کے اصول بتائے گئے۔ رسول اللہ صلعم کے سیاسی اقتدار کا بھی تذکرہ کیا گیا۔ گویا آپؐ کو نبوت کے علاوہ سیاست میں بھی حکمرانی کی پوزیشن حاصل ہو گئی۔ (۵)

---

(۵) ابی محمد عبدالملک بن ہشام۔ سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم۔ جزو ثانی۔ قاہرہ۔ (تاریخ طباعت درج نہیں) ص ۲۰-۱۱۹

دینی معاملات میں آپؐ کی رہنمائی خدا سے وحی کے ذریعے ہوتی تھی لیکن جہاں تک سیاسی معاملات کا تعلق ہے، آپؐ صحابہؓ سے مشورہ فرمایا کرتے تھے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:۔

۱۔ وامرھم شوریٰ بینھم۔ (شوریٰ، آیت ۳۸) (ان کا (مومنوں کا) اجتماعی کام (امر) باہم مشورے سے انجام پاتا ہے۔)

۲۔ وشاورھم فی الامر فاذا عزمت فتوکل علی اللہ۔ (آل عمران، آیت ۱۵۹) (اور اس طرح کے معاملات میں (معاملاتِ امن وجنگ) ان سے مشورہ کرو۔ پھر کسی بات کا عزم کرو تو خدا پر بھروسہ کرو۔)

آخر الذکر آیت میں تو رسول اکرمؐ کو صاف طور پر حکم دیا گیا ہے کہ دنیاوی معاملات میں باہمی مشورہ سے کام کیا کرو (۶) اور ایک دفعہ جب متفقہ فیصلہ کیا جائے تو اس پر کاربند رہنا چاہیے۔ چنانچہ رسول اللہؐ ہر سیاسی فیصلہ عوام میں سے جو اہل الرائے تھے اُن کے مشورہ سے کیا کرتے تھے، نہ صرف یہ بلکہ بعض موقعوں پر ایسا بھی ہوا جب چھوٹے موٹے دنیاوی معاملات کے بارے میں آپؐ کی رائے معلوم کی گئی تو آپؐ نے فرمایا:۔ انتم اعلم بامور دنیاکم۔ تم اپنے دنیاوی معاملات کے متعلق زیادہ علم رکھتے ہو۔ جنگِ بدر اور جنگ احد کے موقعوں پر ہم دیکھتے ہیں کہ آپؐ نے اہل الرائے سے مشورہ لیا اور اس کے مطابق عمل کیا۔ غزوۂ خندق کے موقع پر حضرت سلمان فارسیؓ کا مشورہ (خندق کھودنے کے بارے میں) اتفاق رائے سے منظور ہوا۔

اُس زمانے میں قبیلوں کے سردار اپنے اپنے قبیلوں کے نمائندے ہوتے تھے اور ان کے قبیلے ان کے فیصلوں کو مانتے تھے۔ رسول اللہ صلعم اس زمانے کے دستور کے مطابق قبائل کے سرداروں سے دنیاوی معاملات (سیاسی کہیں تو زیادہ موزوں ہوگا) میں مشورہ لیا کرتے تھے، بے شک ان معاملات میں رسول اللہؐ کی رائے سب پر فائق ہوتی تھی۔ غرض اقتدارِ اعلیٰ جو کہ ایک خالص سیاسی اصطلاح ہے، اُس زمانے میں رسول اللہؐ اور اہل الرائے کو حاصل تھا۔ ان کے اقتدار اعلیٰ پر بے شک کچھ پابندیاں تھیں۔ چنانچہ جہاں تک رسول کریمؐ کا تعلق ہے اس سلسلے میں وحی الٰہی آخری مرکزِ صوابدید تھی، اور آپؐ کے بعد کتاب اللہ

---

(۶) مولانا عبیداللہ سندھیؒ۔ بحوالہ امام ابوبکر جصاص الرازی (تفسیر احکام القرآن)۔ شاہ ولی اللہؒ اور ان کا سیاسی فلسفہ۔
تفسیر ابن کثیر میں ہے:۔ عن علیؓ قال۔ سئل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن العزم فقال مشاورۃ اھل الرائی ثم اتباعھم۔ (حضرت علیؓ روایت کرتے ہیں رسول اللہؐ سے العزمؐ کے بارے میں پوچھا گیا (فاذا عزمت) آپؐ نے فرمایا اہل الرائے سے مشورہ کرنا اور ان کا اتباع کرنا) کنز العمال میں حضرت عمرؓ کا یہ قول مروی ہے:۔ لاخلافۃ الا عن مشورۃ (خلافت مشورے سے ہے۔)

اور سنتِ نبوی اقتدارِ اعلیٰ کی حدود کو تعین کرنے میں ایک قانونی مرجع کی حیثیت رکھتے تھے۔

خلفائے راشدین کے زمانے میں بھی سیاسی امور میں اقتدارِ اعلیٰ کی وہی کیفیت رہی۔ جب کبھی خلیفہ کو اہل الرائے کے کسی گروہ سے اختلاف ہوتا تو وہ عام شوریٰ کرتا اور اپنا نقطۂ نظر اس بڑی جماعت کے سامنے رکھتا اور جب اُسے اِس جماعت کی تائید حاصل ہو جاتی، تو اُسے نافذ کرتا۔ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کی خلافت میں کئی مرتبہ ایسا ہوا تھا۔ خلیفہ کا بعض اوقات اہل الرائے سے اختلاف اور اپنے نظریے کے مطابق عمل کرنے کے بارے میں محمد اسد (لیوپولڈویل) لکھتے ہیں :-

"تاہم یہ سمجھنا مشکل نہیں کہ خلفائے راشدین نے کیوں وقتاً فوقتاً "امرھم شوریٰ بینھم" کے اصول کی شدید پابندی سے اختلاف کیا۔ ایک وجہ تو یہ ہے کہ اسلامی دولتِ مشترکہ کے حالات تیزی سے بدل رہے تھے۔ اور مملکت کے معاملات کا آخری فیصلہ ان لوگوں پر چھوڑ دینا غیر ممکن ہوتا تھا، جو کتنے ہی نیک نیت اور دانش مند کیوں نہ ہوں، مگر وہ اسلامی مملکت کے تمام حالات سے ہر وقت آگاہ نہیں ہو سکتے تھے اور یہ مملکت مسلسل پھیلتی جا رہی تھی۔ مزید برآں خلفائے راشدین اس حقیقت سے بھی پوری طرح آگاہ تھے کہ عام مسلمانوں کا سیاسی شعور ابھی تک ابتدائی حالت میں ہے۔ اور ہر وقت یہ خطرہ لگا رہتا تھا کہ ممکن ہے سیاسی آراء و نظریات پر قبائلی مفاد کی مصلحتوں کا رنگ چڑھ جائے۔ لہٰذا اُنھوں نے مجلسِ شوریٰ قائم رکھی اور ضرورت کے موقع پر مشورے لیتے تھے لیکن مشیروں کی رائے کے رد و قبول میں اپنے آپ کو آزاد سمجھتے تھے"۔(۷)

ہمارے خیال میں اسد صاحب کی یہ توجیہہ کمزور ہے۔ خلفائے راشدین کسی مسئلے میں اختلافات کی صورت میں ہمیشہ عوام کی طرف رجوع کرتے تھے۔ اس کی مثال موجودہ زمانے میں صدارتی طرزِ حکومت کی مجلسِ انتظامیہ کے سربراہ کا مقننہ کے کسی پاس شدہ مسودہ قانون کو ویٹو کرنے کی ہے۔ جب صدرِ مملکت مقننہ کے پاس کیے ہوئے مسودۂ قانون کو رد کرتا ہے تو اُسے یقین ہوتا ہے کہ اگر نوبت ریفرینڈم تک پہنچی تو عوام سربراہِ مملکت کا ساتھ دیں گے۔

حضرت ابوبکر صدیقؓ نے خطبۂ خلافت میں واشگاف الفاظ میں عوام کی سیاسی حاکمیت کا اعلان کیا۔ آپؓ نے فرمایا :-

---

(۷) محمد اسد۔ اسلامی مملکت و حکومت کے بنیادی اصول (اردو ترجمہ غلام رسول مہر) ایڈیشن ۱۹۶۳ء صفحہ ۹

"اے لوگو! میں تمہارا حاکم بنا دیا گیا ہوں۔ حالاں کہ تم سے بہتر نہیں ہوں، اگر میں ٹھیک رہوں تو میری مدد کرو اور اگر غلط راہ اختیار کروں تو مجھے سیدھا کر دو ...." (۸)

یہاں یہ بات ذہن نشین رہے کہ یہ خطبہ اُنھوں نے بحیثیت رسول اللہ صلعم کے جانشین کے دیا تھا" اگر میں ٹھیک ٹھیک رہوں تو میری مدد کرنا اور اگر غلط راہ اختیار کروں تو مجھے سیدھا کر دو" کے اس کے سوا اور کوئی معنی نہیں نکلتے کہ گو میں مسلمانوں کا حکمران ہوں، لیکن میں ان کے تفویض کردہ اختیارات کے بل بوتے پر حکومت کروں گا۔ چنانچہ اگر مجھ سے سیاسی یا مذہبی معاملات میں کوئی لغزش ہو جائے تو عوام کو مجھ سے باز پُرس کرنے کا اختیار ہے کیونکہ اقتدار کے اصل مالک تو وہ ہیں، جنھوں نے مجھے سیاسی معاملات کی نگرانی اور دین کی حفاظت کے لئے منتخب کیا ہے۔

حضرت عمرؓ کے عہد میں بھی سیاسی حاکمیتِ اعلیٰ عوام (یہاں مراد عوام کے نمائندے یعنی اہل الرائے ہیں) کے ہاتھوں میں تھی۔ مجلس شوریٰ کے ارکان کے علاوہ، عام رعایا کو انتظامی امور میں مداخلت کا حق حاصل تھا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے کوفہ، بصرہ اور شام کے گورنروں کو وہاں کے عوام کی مرضی کے مطابق مقرر کیا۔ (۹) اسی طرح تمام عمّال کو حکم تھا کہ ہر سال حج کے وقت حاضر ہوں۔ حج کے موقع پر تمام اطراف کے لوگ موجود ہوتے تھے حضرت عمرؓ کھڑے ہو کر اعلان کرتے تھے کہ جس کسی کو کسی عامل سے شکایت ہو وہ پیش کرے۔ چنانچہ شکایتیں پیش ہوتی تھیں، اور تحقیقات کے بعد ان کا تدارک کیا جاتا تھا۔ ایک دفعہ حضرت عمرؓ نے خطبہ میں کہا کہ صاحبو! عمّال جو مقرر کر کے بھیجے جاتے ہیں، اس لئے نہیں کہ وہ تم پر سختی کریں اور تمہارا مال چھینیں، سو اگر کسی عامل نے اس کے خلاف کیا تو مجھ سے بیان کرو تاکہ میں اس کا انتقام لوں۔ عمرو بن العاصؓ نے جو مصر کے گورنر تھے اُٹھ کر کہا۔ اگر کوئی عامل تادیب کے لئے کسی کو مار یگا تب بھی آپؓ اس کو سزا دیں گے۔ حضرت عمرؓ نے کہا۔ اس خدا کی قسم! جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، ضرور میں سزا دوں گا، کیونکہ میں نے خود رسول اللہؐ کو ایسا کرتے دیکھا ہے۔ (۱۰) حج کے موقع پر عام لوگوں اور دور دراز کے علاقوں سے آئے ہوئے لوگوں کے وفود سے ملنا اور ان کے حالات

---

(۸) تاریخ ابنِ خلدون۔ حصہ اوّل (اردو ترجمہ علامہ حکیم احمد حسین الہ آبادی) نفیس اکیڈمی (۱۹۶۶ء) ص ۲۴۶ اور الصدیق الاکبر، محمد حسین ھیکل۔ (مصر ۱۹۵۸ء) ص ۲۷۔

(۹) ۔ الفاروق۔ حصہ دوم شبلی نعمانی۔ دہلی (۱۸۹۸ء) (۱۰) شبلی نعمانی۔ الفاروق (حصہ دوم) مطبع قدیمی دہلی ص ۱۴۔

سے واقف ہو کر دادرسی کرنا شوریٰ عام کے مترادف تھا۔ اور یہ اس بات کا بین ثبوت تھا کہ حضرت عمرؓ عوام ہی کو سیاسی اقتدارِ اعلیٰ کا مالک سمجھتے تھے۔

بعض لوگوں کو یہ غلط فہمی ہے کہ شام و عراق کی زمینوں کی تقسیم کے بارے میں حضرت عمرؓ نے اہل الشوریٰ سے اختلاف کر کے اپنا نقطۂ نظر ان پر ٹھونسا۔ یہ بات صحیح نہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ جب فاتحِ عراق حضرت سعد بن ابی وقاصؓ نے آپؓ کو خط لکھا کہ اموالِ منقولہ و غیر منقولہ کے بارے میں مجاہدین کا مطالبہ ہے کہ وہ ان میں تقسیم کر دیئے جائیں۔ آپؓ نے یہ معاملہ مجلسِ شوریٰ کے سامنے پیش کیا اور اپنا یہ خیال ظاہر کیا کہ زمین فوج میں تقسیم نہیں ہونی چاہیئے۔ بلکہ وہاں کے باشندوں کے قبضے میں رہنی چاہیئے۔ اکابر صحابہ میں حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ اور حضرت بلالؓ نے آپؓ کی مخالفت کی اور کہا کہ زمین کی تقسیم ہونی چاہیئے۔ حضرت عمرؓ یہ استدلال پیش کرتے تھے کہ اگر ممالک مفتوحہ فوج کو تقسیم کر دیئے جائیں تو آئندہ افواج کی تیاری، بیرونی حملوں کی حفاظت، ملک کے امن و امان اور انتظامیہ چلانے کے لئے مصارف کہاں سے آئیں گے۔ عبدالرحمٰن بن عوف کا اصرار تھا کہ جن کی تلواروں نے ملک کو فتح کیا ہے، انہی کو قبضے کا بھی حق ہے۔ حضرت عمرؓ نے ایک عام اجلاس طلب کیا جس میں قدماء مہاجرین اور انصار میں سے پانچ قبیلہ اوس اور پانچ قبیلہ خزرج کے سردار شریک ہوئے۔ حضرت علیؓ، حضرت عثمانؓ اور حضرت طلحہؓ نے حضرت عمرؓ کی رائے سے اتفاق کیا۔ تاہم کئی دن تک یہ مسئلہ زیرِ بحث رہا اور کوئی فیصلہ نہ ہو سکا۔ آخر میں حضرت عمرؓ نے قرآن مجید کی ایک آیت سے استدلال کیا جو اس بحث کے لئے نص قاطع تھی۔ اس آیت سے حضرت عمرؓ نے یہ استدلال کیا کہ فتوحات میں آئندہ نسلوں کا بھی حق ہے لیکن اگر فاتحین کو زمین تقسیم کر دی جائے تو آنے والی نسلوں کے لئے کچھ باقی نہ رہے گا۔ چنانچہ آپؓ نے اس آیت کی تشریح میں ایک تقریر کی اور اپنا یہ استدلال پیش کیا۔ تمام لوگوں نے آپؓ کی رائے سے اتفاق کیا (۱۱)۔ اس کے بعد آپؓ نے اپنے فیصلے کو عملی جامہ پہنایا۔

حضرت عمر فاروقؓ کے بعد حضرت عثمانؓ کا انتخاب بھی اس زمانے کے حالات کے مطابق ایک صحیح جمہوری اصول کے تحت عمل میں آیا لیکن ان کی خلافت کے آخری دور میں اقتدارِ اعلیٰ کے بارے میں امت کا وہ

---

(۱۱)۔ ابو یوسفؒ، کتاب الخراج۔

اتفاق رائے نہ رہا، جو اس سے پہلے تھا۔ کچھ شورش پسندوں نے خلیفہ کے خلاف بغاوت کر دی اور بجائے اس کے کہ اہل الرائے فیصلہ کرتے، شورش پسندوں نے خلیفہ کو شہید کر دیا۔

اب سیاسی اختلافات رونما ہو چکے تھے لہٰذا حضرت علیؓ کے زمانے میں بھی یہی حالت رہی لیکن اس کے باوجود یہ تصور کبھی نہیں رہا کہ سیاسی اقتدار اعلیٰ خدا کو حاصل ہے۔ چنانچہ جب خوارج نے یہ نعرہ بلند کیا کہ ان الحکم الا للہ "حکم صرف خدا کا ہے" تو حضرت علیؓ نے جواباً کہا "اللہ اکبر۔ یہ ایک کلمہ حق ہے لیکن اس سے باطل مراد لیا جا رہا ہے"۔ (۱۲)

اموی دور میں خلافت کا عہدہ خالص سیاسی تھا۔ اُموی خلفاء نے کبھی اس کو مذہب کا رنگ دینے کی کوشش نہیں کی۔ ان کی پشت پناہی عرب قبائل کے سردار کرتے تھے۔ چنانچہ اقتدار اعلیٰ ان سردارانِ قبائل کے توسط سے خاندانِ اُموی کو حاصل تھا۔ چونکہ اُمویوں نے خلافت کو مذہب کا رنگ نہیں دیا اور مذہبی معاملات علماء پر چھوڑ دیئے تھے اس لئے بہت جلد اس خاندان کو زوال آگیا اور مسلمانوں کے مذہبی طبقے اُن کی حمایت کے لئے آمادہ نہ ہوئے۔ بنو اُمیہ کے آخیر سالوں میں کئی سیاسی تحریکیں مذہب کے نام سے اُٹھیں۔ ان میں مرجئہ کا نام سرِفہرست ہے۔ حارث بن سریح کی قیادت میں مرجئہ (۱۳) نے بلاد ماوراء النہر میں بنی اُمیہ کے خلاف بغاوت کر دی ...... حارث بن سریح اپنے آپ کو مہدی بتاتا تھا اور کہتا تھا کہ میں ستم زدہ لوگوں کو جبر و استبداد سے چھٹکارا دلانے اور مظلوموں کی مدد کے لئے آیا ہوں۔ حارث اپنی آمد کا یہ مقصد بھی بیان کرتا تھا کہ قرآن و سنت پر لوگوں سے عمل کرایا جائے اور ایسی حکومت کا انتخاب کیا جائے جسے اکثریت کی حمایت حاصل ہو"۔ (۱۴)

اسی زمانے میں عباسیوں کی خفیہ تحریک بھی زوروں پر تھی۔ جب وہ برسرِ اقتدار آئے تو اُنہوں نے خلافت

---

(۱۲) تاریخ طبری (اردو ترجمہ نفیس اکیڈمی کراچی) حصہ سوم صہ ۴۰۱ - ۴۰۲

(۱۳) مرجئہ وہ فرقہ تھا جو دمشق میں پہلی صدی ہجری کے نصف میں نمودار ہوا اور اپنے خیالات میں مسیحی معتقدات سے متاثر تھا۔ ان کا خیال تھا کہ کسی فرد کے کفر و ایمان کا فیصلہ خود کرنے کی بجائے اللہ تعالیٰ پر چھوڑ دینا چاہیئے کیونکہ وہی جزا و سزا کا مالک ہے۔ ڈاکٹر حسن ابراہیم۔ مسلمانوں کی سیاسی تاریخ۔ جلد دوم (اردو ترجمہ مجلس ترقیِ ادب لاہور ۱۹۵۹ء)۔ (۱۴) ایضاً صہ ۱۳

کو اپنے خاندان کے اندر رکھنے کے لئے اسے مذہبی منصب بنایا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عباسی خاندان کے کمزور خلفاء کے باوجود خلافتِ عباسی کا مذہبی اقتدار کئی سو سال تک برقرار رہا۔ اسی زمانے میں سیاسی اغراض کے پیشِ نظر اقتدارِ اعلیٰ کو خدا کی طرف منسوب کیا گیا۔ چنانچہ ابوجعفر المنصور (خلیفہ دوم) نے جن کو خلافتِ عباسیہ کا اصلی بانی بھی کہا جاتا ہے، اپنے خطبۂ مکہ میں خدا کی حاکمیتِ اعلیٰ کا اظہار یوں کیا ہے:۔

"اے لوگو! میں خدا کی سرزمین میں اس کی طرف سے حاکم ہوں۔ میں اس کی توفیق، تائید اور امداد سے تم پر حکومت کروں گا۔ میں اس کے مال کا محافظ ہوں جسے میں اس کی مشیئت اور ارادے کے مطابق استعمال کروں گا۔ مجھے خدا نے اس پر قفل کی مانند بنایا ہے اگر وہ مجھے کھولنا چاہے تو میں تم پر رزق اور نعمتیں کھول دوں گا۔ اگر وہ بند کرنا چاہے تو میں تم پر یہ چیزیں بند کر دوں گا۔" (۱۵)

جس عمارت کی سنگِ بنیاد منصور نے رکھی، اس کے جانشینوں نے اس کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔ چنانچہ "آگے چل کر سنّی مسلمانوں کا یہ عقیدہ سا ہو گیا کہ خلافت کے بغیر مسلمانوں کی ملی زندگی کا تصور نہیں کیا جا سکتا اور خلافت منجملہ ارکان مذہب کے سمجھی جانے لگی۔" حالانکہ، جیسا کہ "الاسلام و اصول الحکم" کے مصنف علی عبدالرازق نے لکھا ہے:۔

"سلاطین کی مصلحت اسی میں تھی کہ یہ غلط خیال (خلافت، دین کا ایک جزو ہے) لوگوں میں راسخ ہو جائے تاکہ وہ دین کو ایسی زرہ بنا لیں جو ان کے تخت کی حفاظت کر سکے۔ اور انہیں باغیوں سے بچا سکے۔ وہ مختلف حیلوں سے اس پر عمل پیرا رہے۔ اور وہ کتنے متعدد حیلے تھے اگر محققین اس کی طرف توجہ کریں۔ یہاں تک کہ انہوں نے لوگوں کی عقل میں یہ بات ڈال دی کہ ائمہ کی اطاعت خدا کی اطاعت ہے اور ان کی نافرمانی خدا کی نافرمانی ہے۔ اس کے بعد کے خلفاء نے اسی پر اکتفا نہ کیا اور انہیں وہ لقب مطمئن نہ کر سکا جو حضرت ابوبکرؓ نے انتخاب کیا تھا۔ اُنھوں نے اسے مسترد نہ کیا جس پر حضرت ابوبکرؓ نے ناراضگی ظاہر کی تھی۔ (خلیفۃ اللہ) اور اُنھوں نے سلطان کو زمین پر خدا کا خلیفہ اور اس کے بندوں پر اس کا ظلِّ ممدود بنا کر رکھ دیا۔" (۱۶)

بعد کے خلفاء کا ہاتھ مضبوط کرنے میں ہمارے علماء کا بھی بڑا ہاتھ تھا۔ انہوں نے ہر حالت میں بادشاہ

---

(۱۵) ابن عبد ربہ۔ العقد الفرید۔ ج ۲۔ ص ۱۷۹۔

(۱۶) علی عبدالرازق۔ الاسلام و اصول الحکم۔ (ترجمہ راجہ ف۔م۔ ماجد) ص ۱۶۳۔

کی اطاعت پر زور دیا۔ اُنھوں نے موجودہ نظام کے پیشِ نظر بادشاہوں کے اعلیٰ صفات کا ذکر تو کیا لیکن علم سیاست کی طرف دوسرے علوم کے مقابلے میں کچھ توجہ نہ دی۔ حالانکہ ان کے پاس ایسے مواقع بکثرت تھے جو انہیں علومِ سیاست کی مبسوط تحقیق پر آمادہ کرتے اور وہ اسباب ان کی نگاہوں پر عیاں تھے جو انہیں اِن علوم میں تعمق پر اکساتے۔ (۱۷)

لیکن اس کے باوجود یہ نظریہ، کہ حکم خدا کا ہے، ایک لحاظ سے اُس زمانے اور اُن حالات کے لئے موزوں اور مناسب تھا۔ کیونکہ اس سے شریعتِ اسلامی اس وقت کے سرکش حکمرانوں کے لامحدود اختیارات پر ایک طرح روک کی حیثیت رکھتی تھی۔ اور حکمران شریعتِ اسلامی کی خلاف ورزی کرنے کی جرأت نہ کر سکتے تھے۔ اگر کوئی حکمران شریعت کے خلاف اقدام کرتا تو علماء اس کے راستے میں حائل ہو جاتے۔

خلافت جب ترکانِ عثمانی کے ہاتھ آئی، تو علماء کا بادشاہوں پر کافی اثر تھا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ دولتِ عثمانیہ میں چار طرح کے قوانین جاری تھے۔ (۱) شریعت۔ (۲) قانون یعنی سابق سلطانوں کے فرامین۔ (۳) قومی و ملکی رواج جو قدیم سے چلے آتے تھے۔ (۴) عرف یعنی موجودہ سلطان کا "ارادہ" یا فرمان۔ شریعت کے قوانین سلطان سے بالاتر تھے۔ وہ ان میں کوئی تبدیلی نہیں کر سکتا تھا، علماء کو اس بارے میں مکمل اختیار تھا۔ آخر میں جب عثمانی سلطنت کو زوال آیا تو علماء ہر ترقی و تبدیلی کے مخالف ہو گئے۔ سلطان محمود کے بعد سلطان عبدالمجید (۶۱ - ۱۸۳۹ء) نے اصلاحات کا دَور شروع کیا۔ انہیں احساس تھا کہ اقتدار کے اصل مالک تو عوام ہی ہیں چنانچہ انہی کے دَور سے تحریکِ تنظیمات شروع ہوئی۔ رعایا کو جان و مال کی حفاظت دی گئی۔ مذہبی آزادی دی گئی، شخصی حکومت رفتہ رفتہ دستوری حکومت میں بدلنے لگ گئی۔ عبدالعزیز کے زمانے سے پھر مطلق العنانی کا آغاز ہو گیا۔ لیکن عوامی شعور اب بیدار ہو چکا تھا۔ مشرق کے افق پر کچھ جگ مگاتے ہوئے تارے نمودار ہو چکے تھے۔ مدحت پاشا ان میں سے ایک تھے۔ ان کی کوششوں سے دسمبر ۱۸۷۶ء میں سلطان عبدالحمید نے ایک صحیح جمہوری حکومت کے قیام کے سلسلے میں پہلا قدم اُٹھایا۔ دو ایوانوں پر مشتمل مجلسِ قانون ساز کا قیام عمل میں آیا۔ سینیٹ (SENATE) کے اراکین کو نامزد کیا جاتا تھا اور دارالنائبین (HOUSE — OF REPRESENTATIVES) کے اراکین خفیہ بیلٹ (SECRET BALLOT) کے ذریعہ چار سال کے لئے منتخب کئے جاتے تھے۔ اور ایک نمائندے کا حلقۂ نمائندگی پچاس ہزار نفوس پر مشتمل ہوتا تھا۔ مدحت پاشا اس عوامی حکومت کے پہلے صدر اعظم مقرر ہوئے۔ لیکن یہ دَور عارضی ثابت ہُوا۔

---

(۱۷)۔ ایضاً۔ ص ۵۷۔

سلطان عبدالحمید کو ابوالھدیٰ جیسے شیوخ مل گئے جنہوں نے سلطان کو زمین پر خدا کا سایہ بنا دیا۔ اور کہا کہ عوام کو ہر حالت میں سلطان کی اطاعت کرنی چاہیئے۔ ایسے ہی مفاد پرست لوگوں نے اس کا دماغ پھیر دیا۔ چنانچہ مدحت پاشا کو جلاوطن کر دیا گیا۔ اور بعد میں واپس بلا کر شام اور پھر سمرنا کا گورنر مقرر کیا لیکن آخیر میں ان کو راستے سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ہٹا دیا گیا۔ سلطان نے ۱۸۷۸ء میں پارلیمنٹ توڑ کر پھر سے مطلق العنانی کا آغاز کر دیا۔ لیکن مدحت پاشا کی موت سے آزادی کے وہ خیالات فنا نہیں ہوئے جو دورِ تنظیمات سے ترکوں کے اندر پرورش پا رہے تھے۔

۱۹۰۸ء تک ترکی کے جیالے نوجوان عوامی اقتدارِ اعلیٰ کے لئے سر توڑ کوششیں کرتے رہے اور آخرکار سلطان عبدالحمید کو مجبور کر دیا گیا کہ وہ ایک ایسی دستوری حکومت کا اعلان کریں جس کی اساس مدحت پاشا کی سکیم پر ہو۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا ——— خلافت ختم کرنے کے بعد کمال اتاترک کی قیادت میں جمہوریہ ترکیہ نے گزشتہ سلطنت کے کھنڈر پر ایک مستحکم قلعہ تعمیر کر لیا۔ "یورپ کا مردِ بیمار" دم توڑنے کے بعد نہ صرف جی اُٹھا بلکہ اس کے اندر صحت و شباب کی ساری قوتیں عود کر آئیں۔ تاآنکہ بیسویں صدی کی عیسائی دنیا کو بھی اس معجزہ کا قائل ہونا پڑا۔

جیسا کہ ہم لکھ چکے ہیں اقتدارِ اعلیٰ ایک خالص سیاسی اصطلاح ہے۔ اور اس کی بنیاد طاقت پر ہے۔ "خدا نے چونکہ دنیاوی معاملات اپنے نیک بندوں پر چھوڑے ہیں اور قرآن نے کوئی ایسا دستورِ حکومت متعین نہیں کیا جس پر آنحضرتؐ کی وفات کے بعد مسلمان عمل درآمد کرتے"(۱۸) لہٰذا مسلمان ہی سیاسی معاملوں میں مقتدرِ اعلیٰ ہیں۔ خدا سیاسی مفہوم میں کبھی مقتدرِ اعلیٰ نہیں ہو سکتا۔ ویسے بے شک تمام کائنات پر خدا کا کنٹرول ہے۔ کون سی ایسی چیز ہے جو اس کی نہیں۔ ہر چیز اس کا عطیہ ہے اور انسان اسے خدا کی رضا کے مطابق استعمال کرے تو خدا کا شکر گزار بندہ ہوگا۔ مگر اقتدارِ اعلیٰ کے مالک عوام ہیں۔ البتہ اگر وہ مسلمان ہیں تو لازم ہے کہ قرآن و سنت کی پیروی کریں۔ نہیں کریں گے تو ان کا دعویٰ اسلام باطل ہوگا۔ دوسری قومیں اگر بین الاقوامی قانون، رسم و رواج کی پابندی اور ایک دوسرے پر معاشی انحصار کے باوجود مقتدرِ اعلیٰ رہ سکتی ہیں تو کیوں مسلمان قرآن اور سنت کی پیروی کرتے ہوئے مقتدرِ اعلیٰ نہیں رہ سکتے۔ مسلمان باوجود مقتدرِ اعلیٰ ہونے کے ایسا قانون نہیں بنائیں گے جو احکامِ خداوندی اور اسوۂ رسول کی خلاف ورزی کرتا ہو۔

مختصراً اسلامی ریاست میں اقتدارِ اعلیٰ کے مالک عوام اور صرف عوام ہیں۔ اس معنی میں نہ خدا، نہ بادشاہ اور نہ کوئی خلیفہ مقتدرِ اعلیٰ ہو سکتا ہے۔ چونکہ عوام کے لئے قانون سازی کا کام مشکل ہوتا ہے لہٰذا وہ اپنے اختیارات اپنے نمائندوں کو تفویض کر دیتے ہیں۔ جو کہ مختلف مکاتبِ فکر سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان پر عوام کا دباؤ اور قرآن و سنّت کی پابندی لازمی ہے۔ عوام کے منتخب شدہ نمائندوں کے علاوہ کسی گروہ کو قانون سازی کی اجازت نہیں۔

***

(۱۸) ڈاکٹر حسن ابراہیم و علی ابراہیم حسن مصری۔ مسلمانوں کا نظمِ مملکت (اردو ترجمہ ادارہ ندوۃ المصنفین دہلی) صہ ۲۲۔